سائنسی ترقی میں اِسلام اور مسلمانوں کی خدمات
قرآنِ حکیم کی روشنی میں

حافظ زاہد علی☆

یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن حکیم کوئی سائنس کی کتاب نہیں بلکہ دین واخلاق اور شرعی قوانین کی کتاب ہے، لیکن ضمناً اس میں فطرت کی تمام نیرنگیوں اور مختلف علوم وفنون کے حقائق معارف کا تذکرہ موجود ہے جس کو ہر علم وفن کا ماہر گہری نگاہ اور عمیق نظر ڈالنے سے معلوم کرسکتا ہے بلکہ بعض دفعہ اس کی عظمت وجلال کے نقوش اس پر اس طرح مرتسم ہوتے ہیں کہ وہ حیرت زدہ اور مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے۔

جس ہستی نے اس کائنات کو تخلیق کیا اور جو ذات اس کو عدم سے وجود میں لائی اس ہستی اور ذات نے اس کلام برتر کو بھی نازل فرمایا اور ان دونوں میں اس قدر مطابقت، ہم نوائی اور ہم آہنگی رکھی کہ مختلف علوم وفنون کے ماہرین جب ایک طرف کائنات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور دوسری طرف قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے لیے مختلف علوم کے اسرار ورموز کا ایک دروازہ کھل جاتا جس سے جھانک کر انہوں نے ان علوم وفنون کے مختلف اصول و ضوابط وضع کیے۔ اگر یہ کہا جائے تو یہ نہ تو مبالغہ ہوگا اور نہ ہی کذب کہ قیامت تک جتنے بھی علوم وفنون خصوصیت کے ساتھ نظام کائنات کے متعلق وجود میں آتے جائیں گے اور ان کی جو بھی تحقیق ہوتی جائے گی ان کی تمام تفصیلات کو قرآنی اشارات کے ذیل میں لایا جاسکتا ہے۔ اور حدیث میں جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ کس قدر درست اور صحیح ہے کہ:

﴿القرآن لا یخلق علی کثرة الردّ ولا تنقضی عجائبه. وهو الفصل لیس بالهزل ولا یشبع منه العلماء ولا تزیغُ به الاهواء﴾ (۱)

ترجمہ:- ''قرآن حکیم کو جتنی بار پڑھا جائے یہ پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے، یہ حق وباطل میں فیصلہ کرنے والی کتاب ہے، یہ مذاق نہیں ہے۔ علماء اس سے سیر نہیں ہوتے اور اس سے خواہشات نفسانی میں کجی پیدا نہیں ہوتی۔''

بہر حال قرآن حکیم کے مطالعہ اور کائنات پر تفکر وتدبر کی وجہ سے ایک ہمہ دان اور ہمہ بین ہستی کا

☆ لیکچرر، شعبہ عربی گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

وجود ثابت ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ قرآن حکیم اس کائنات اور نظام کائنات کا امین ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں کئی جگہ فرمایا گیا

﴿ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شی.﴾ (۲)

ترجمہ:- ''اور ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی جو ہر شی کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔''

اور ایک جگہ پر ارشاد فرمایا:

﴿وما من غائبة فی السماء والارض الا فی کتاب مبین﴾ (۳)

ترجمہ:- ''اور زمین و آسمان کا کوئی ایسا راز نہیں ہے جو اس کتاب مبین میں موجود نہ ہو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿آیاتنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق، أولم یکف بربک انه علی کل شی شهید﴾ (۴)

ترجمہ:- ''اور ہم (ان منکرین حق کو) ایسے نشانات دکھا دیں گے، اطراف عالم میں بھی اور خود ان کی اپنی ہستیوں میں بھی، تا آنکہ اس کلام کی حقانیت ان پر واضح ہو جائے۔ کیا یہ بات ان کی (تسلی و تشفی کے لیے) کافی نہیں ہے کہ تیرا رب (اس کائنات کی) ہر چیز سے واقف و آشنا ہے۔''

ان آیات اور ان کے علاوہ قرآن حکیم کی اور کئی آیات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان مظاہر کائنات اور کائنات پر غور و فکر کرے۔ چنانچہ جن لوگوں نے علم جدید سائنس میں کمال حاصل کیا ہے وہ جب قرآن حکیم پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو نہ صرف ان کو اس کا معجزہ ہونا صاف نظر آتا ہے بلکہ ان پر سائنس اور علوم جدیدہ کے اسرار و معانی بھی منکشف ہوتے ہیں جو قرآن حکیم کے علاوہ کسی اور کتاب میں انہیں نظر نہیں آتے۔ کائنات اور نظام کائنات کے بارہ میں ان حقائق کو قرآن حکیم میں بیان کرنے کی غرض و غایت حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں ''التذکیر بآلاء اللہ'' ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی نوازشات اور مظاہر کائنات کے ذریعہ تذکیر و انتباہ تا کہ یہ مغرور اور باغی انسان اپنی باغیانہ روش سے باز آجائے اور نیکی اور خدا پرستی کا راستہ اختیار کر لے۔ (۵)

مختصر یہ کہ قرآن حکیم کی مختلف آیات میں کائنات اور نظام کائنات کے علوم و معارف کا ایک بحر محیط موجزن ہے، اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے حقائق منظر عام پر آرہے ہیں۔ پھر قرآن حکیم کی آیات کی غرض و غایت اور سب سے بڑھ کر ان کا اچھوتا، دل نشین اور سحر انگیز اسلوب بیان یہ سب ایسے امور

ہیں جن سے ذوق و وجدان رقص کرنے لگ جاتا ہے ہے اور عقل بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ یہ یقیناً کلام الٰہی ہے۔

سائنس کا اس وقت دنیا میں دور دورہ ہے۔ انسانیت نے سائنس کے میدان میں ہر شعبہ میں ترقی کی نئی نئی راہیں تلاش کی ہیں، اور اب بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ انسان اب پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگا اور مچھلیوں کی طرح سمندر کی تہوں میں تیرنے لگا۔ اسی سائنس کا ایک شعبہ حیاتیات (Biology) بھی ہے جس کا مطلب ہے ''زندگی کا علم'' یعنی The Sicence of Life بیالوجی کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ ایک علم نباتات (Botoany) اور دوسرا علم حیوانات (Zoology)۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی کئی شاخیں ہیں۔ تمام حیوانات اور نباتات میں سے ہر نوع کا ایک مخصوص طرز پیدائش، افزائش نسل، نشو ونما اور بڑھاپا اور موت کے مخصوص اطوار ہوتے ہیں۔ جس کے مطابق وہ اپنی طبعی اور فطری زندگی گزارتا ہے۔ تمام حیوانات و نباتات کے اجسام کا نشو ونما اور اس کی بڑھوتی و افزائش ایک مسلسل کیمیاوی عمل کے تحت خلیوں (Cells) میں انجام پاتی ہے۔ اس عمل کے ذریعہ ہر خلیہ مسلسل دو دو حصوں میں تقسیم ہوتا اور اپنی جگہ پر مکمل خلیہ بنتا چلا جاتا ہے۔ تمام حیاتیاتی اجسام کی افزائش اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔ اس عمل کو نظام تحول (Metabolism) کہا جاتا ہے۔ اگر چہ حیوانات کی طرح نباتات بھی حساس ہوتے ہیں لیکن حیوانی دنیا میں نظام عصبی (Nervous System) بہت ترقی یافتہ ہے نباتاتی دنیا میں یہ نظام نہایت ادنیٰ درجے کا ہے۔

اس بارے میں مزید گفتگو کرنے سے قبل یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ چیز اسلام کی خصوصیت میں سے ہے کہ وہ نوع انسانی سے خالق کائنات کا تعارف ''رب'' کی حیثیت سے کراتا ہے تاکہ خالق کائنات کی تعظیم و تقدیس اس کی ربوبیت کی بنا پر کی جائے۔ یہ ایک عقلی دلیل بھی ہے اور ربوبیت سے الوہیت پر استدلال بھی۔ دعوت کا یہ طریقہ کسی اور مذہب میں نہیں ہے اور یہ طریقہ بالکل فطری اور عقلی بھی ہے۔

''رب'' کے لغوی معنی تو ہیں "انشاء الشی حالاً فحالاً الیٰ حدالتمام" (٦)

یعنی کسی چیز کو درجہ بدرجہ حد کمال تک پہنچانا۔ اور یہ مفہوم جدید سائنسی علوم کی روشنی میں نہ صرف حیوانات و نباتات پر صادق آتا ہے بلکہ عالم جمادات اور عالم سماوات پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رب وہ ہے جو ایک ننھے سے ایٹم سے لے کر سیاروں تک کی مخلوقات کو اس کے فطری اور طبعی ضوابط کے مطابق نشو ونما دینے والا اور ہر ایک کو بتدریج حد کمال تک پہنچانے والا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تمام مخلوقات اپنی نشو ونما میں اس کی محتاج اور دست نگر ہیں اور وہ سب پر غالب اور حکمران ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم

میں ہے:

﴿وله من فی السمٰوات والارض کل له قانتون﴾ (۷)

ترجمہ:- ''زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب کا مالک وہی ہے اور سب اسی کی بارگاہ میں جھکے ہوئے ہیں''

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا ذکر ہے وہاں اس نے مخلوقات کی بڑھوتری اور نشوونما کا ایک مخصوص فطری اور طبعی ضابطہ بھی بیان کیا ہے پھر ہر ایک کو اس ضابطہ کے عین مطابق چلنے کی توفیق بھی دی۔ وہ طبعی اور فطری ضابطہ کیا ہے: تخلیق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے مختلف آیات میں بیان فرمایا، لیکن سورت الاعلیٰ میں ان چاروں چیزوں کو اکٹھا بیان فرمایا:

﴿سبح اسم ربک الاعلیٰ، الذی خلق فسویٰ، والذی قدر فهدیٰ﴾ (۸)

ترجمہ:- ''پاکی بیان کر اپنے رب کے نام کی، جس نے پیدا کیا پھر درست کیا، جس نے مقرر کیا پھر راہ بتلائی۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿یاایها الانسان ماغرک بربک الکریم، الذی خلقک، فسواک، فعدلک، فی ایّ صورة ماشاء رکبک﴾ (۹)

ترجمہ:- ''اے انسان کس شی نے تجھے دھوکے میں ڈالا اپنے رب کریم کے بارہ بارے میں، جس نے تجھ کو عدم سے وجود بخشا، پھر (تیرے انسانی اعضاء کو پورے تناسب کے ساتھ) درست کیا۔ پھر (تیرے مزاج اور تیری خصلتوں اور تیرے جسم میں کارفرما باطنی اور ظاہری نظاموں کو) معتدل بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو ڈھال دیا۔''

ان آیات کے علاوہ اور بھی کئی آیات ہیں جن میں ان چار چیزوں کو بیان فرمایا تا کہ لوگوں کو اس کی ربوبیت کے فطری ضابطہ کا علم ہو۔

نظام تخلیق:

خلق کے معنی ہیں کسی چیز کو سابق مثال کے بغیر عدم سے وجود میں لانا۔ لسان العرب میں ابوبکر ابن الانباری کا قول نقل کیا گیا ہے کہ کلام عرب میں ''خلق'' کی دو صورتیں ہیں:

(۱) کسی شی کو انوکھے طریقہ پر وجود میں لانے کے بعد پھر اسی سابقہ طرز پر پیدا کرتے رہنا۔

(۲) اندازہ کرنا۔ (۱۰)

چنانچہ قرآنِ حکیم میں ہے:

﴿فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین﴾ (۱۱)

ترجمہ:- ''یعنی اللہ بہترین اندازہ کرنے والا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ خلق کا اطلاق تین معنوں پر ہوتا ہے۔

(۱) کسی سابقہ مثال کے بغیر کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔

(۲) کسی چیز کو عدم سے وجود میں لا چکنے کے بعد پھر اسی مادے سے دوسری چیزیں پیدا کرتے رہنا۔

(۳) اندازہ کرنا۔

آج انسان اس ترقی یافتہ زمانہ میں قریباً آٹھ لاکھ حیوانات اور چار لاکھ نباتات کے وجود کا پتہ لگا چکا ہے لیکن کسی ایک نوع کے بارہ میں بھی باوجود اس سائنسی ترقی کے وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اس نوع کا خالق ہے۔ خلاق عالم لاکھوں انواع حیات کو بغیر کسی سابق مثال کے وجود میں لا چکا ہے اور پھر ہر نوع کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ان کی تمام نوعی خصوصیات کے عدم سے وجود میں برابر لا رہا ہے لیکن حق تعالیٰ شانہ کے علاوہ اور کوئی ایسی ہستی اس کرہ اغبر پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے چودہ سو سال پہلے جو دعویٰ کیا تھا وہ آج بھی صحیح اور صادق ہے کہ:

﴿ان الذین تدعون من دون اللّٰہ من یخلقوا ذباباً، ولو اجتمعوا لہ﴾ (۱۲)

ترجمہ:- ''جن لوگوں کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو (ان کی حالت یہ ہے کہ) وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب اس کام کے لیے جمع ہو جائیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''یعنی مکھی بہت ہی ادنیٰ اور حقیر جانور ہے، جن چیزوں میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ وہ سب مل کر ایک مکھی پیدا کر دیں، یا مکھی ان کے چڑھاوے وغیرہ میں سے کوئی چیز لے جائے تو اس سے واپس لے لیں ان کو ''خالق السماوات والارضین'' کے ساتھ عبودیت اور خدائی کی کرسی پر بٹھا دینا کس قدر بے حیائی، حماقت اور شرمناک گستاخی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مکھی بھی کمزور، مکھی سے زیادہ ان کے بت کمزور اور بتوں سے بڑھ کر ان کو پوجنے والا کمزور ہے جس نے ایسی کمزور اور حقیر چیز کو اپنا معبود اور حاجت روا بنا لیا۔'' (۱۳)

آج پوری دنیائے سائنس مل کر بھی ایک مکھی یا مچھر پیدا کرنا تو بہت دور کی بات ہے اس کا ایک ادنیٰ درجہ کا جرثومہ بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اس طرح سائنس دانوں کے پیوند کاری (Grafting) سے مختلف رنگوں کے گلاب تو پیدا کر لیے لیکن زمین کا ایک ذرہ پوری دنیائے سائنس مل کر نہیں بنا سکی۔

﴿ان ربک ھوا الخلاق العلیم﴾ (۱۴)

ترجمہ:- ''بے شک تیرا رب ہی خلاق اور ہمہ دان ہے۔''

''خلاق'' عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ''الخالق خلقاً بعد خلق''یعنی ایک کے بعد دوسری مخلوق پیدا کرنے والا۔

بتایا یہ کہ حیوانات اور نباتات کی لاکھوں قسموں کو پیدا کرنے والا تیرا رب ہی ہے کیونکہ وہ ''خلاق علیم'' ہے، اس کے علاوہ پوری کائنات میں اور کوئی شخص خواہ وہ ایک ہو یا پوری جماعت کسی نوع کے خلق و آفرینش کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے واشگاف الفاظ میں کہا:

﴿ام جعلوا للّٰہ شرکاء خلقوا کخلقہ، فتشابہ الخلق علیھم، قل اللّٰہ خالق کل شئی وھوالواحد القھار﴾ (۱۵)

ترجمہ:- ''کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ (کی خدائی میں) ایسے بھی شریک ٹھہرا رکھے ہیں جنہوں نے اللہ کی تخلیق کی طرح کوئی تخلیق کر دی ہو جس کی وجہ سے ان کو (ان دونوں قسم کی) تخلیقات میں التباس ہو گیا ہو۔ آپ کہہ دیں کہ اللہ ہی ہر شی کا خالق ہے اور وہ اکیلا اور قہار ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ان لوگوں کی بے بسی ان الفاظ میں ظاہر فرمائی:

﴿واتخذوامن دونہ آلھۃ لا یخلقون شیئًا وھم یخلقون، لایملکون لا نفسھم ضراً ولا نفعاً، ولا یملکون موتاً ولاحیوٰۃً ولا نشوراً﴾ (۱۶)

ترجمہ:- ''ان لوگوں نے اللہ کے سوا (اسے بے بسوں کو) معبود بنالیا ہے جو کسی بھی شے کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کیے گئے ہیں (لہٰذا جو خود مخلوق ہو وہ خالق کیسے ہوسکتا ہے اسی وجہ سے) ان کو نہ تو اپنے ذاتی نقصان اور نفع کا کوئی اختیار ہے، نہ موت کا، نہ زندگی کا اور نہ دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کا۔''

بتایا یہ کہ اگر چہ ظاہری طور پر انسان مختار نظر آتا ہے لیکن وہ اتنا بے بس، درماندہ اور عاجز ہے کہ اگر چہ وہ ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے، ستاروں کی گزرگاہوں کی تلاش میں ہے، لیکن اپنی بے بسی اور درماندگی کی وجہ سے وہ ایک مکھی اور مچھر جیسی حقیر شی بھی پیدا کرنے سے قاصر ہے بلکہ جرثومۂ حیات (Protoplasm) کی حقیقت کو سمجھنے تک سے عاجز اور بے بس ہے، تخلیق کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔

نظام تسویہ:

عربی کے مشہور لغت القاموس لسان العرب اور مفردات امام راغب کے مطابق تسویہ کا مطلب ہے ہر قسم کی جسمانی درستگی جس میں حد درجہ اعتدال ملحوظ رکھا گیا ہو اور اس میں کسی قسم کا کوئی عیب اور نقص نہ ہو۔ جس کی مثال یہ ہے کہ ایک ہاتھ بیس انچ اور دوسرا تیس انچ یا ایک آنکھ ایک انچ کی اور دوسری دس انچ کی۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان اور دوسرے حیوانات کے ایک ایک عضو میں حیرت انگیز اعتدال، یکسانیت اور تناسب ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے پورے جسمانی نظام میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے چھوٹے حیوان سے لے کر ایک بڑے سے بڑے ہاتھی اور دوسرے حیوانات خواہ وہ خشکی کے ہوں یا پانی کے، ان کی ساخت میں ایک حیرت زدہ اور تعجب انگیز نظم و ضبط اور اعلیٰ درجہ کی صناعی رکھی گئی جس کو دیکھ کر ہر انسان "فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین" پکار اٹھتا ہے۔ (۱۷)

چنانچہ سید محمود آلوسیؒ نے اپنی تفسیر میں تسویہ کے معانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿جعله متساوياً وهو اصل معناه والمراد فجعل خلقه كما تقتضيه حكمة سبحانه في ذاة و صفاة، وفي معانه ماقيل اَیْ فجعل الأشياء سواء في باب الاحكام والاتقان، وَلَانَّهٗ سبحانه اتقن بعضاً دون بعضٍ﴾ (۱۸)

ترجمہ:۔ ''یعنی بالکل ٹھیک ٹھاک کیا یہ تو اصل معنی ہیں، اور اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی حکمت کے تقاضا کے عین مطابق بنایا جیسا کہ اس کی ذات اور صفات اس کی مقتضی تھی اور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس نے تمام اشیاء کو محکم اور مضبوط طور پر بنایا ہے، ایسا نہیں بنایا کہ بعض میں تو اتقان ملحوظ رکھا گیا ہو اور بعض میں نہ رکھا گیا ہو۔''

علامہ طنطاوی نے جن کی تفسیر میں بعض مقامات پر کچھ سائنسی حقائق کو بھی بیان کیا گیا ہے، یہاں بھی انہوں نے بڑی اچھی اور جدید تحقیقات کی روشنی میں بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس کائنات کی خلقت اور آفرینش میں ہمہ دان کی طرح نظم و استحکام رکھا گیا ہے، جیسا کہ چہرہ کی خوبصورتی چار اعضاء میں رکھ دی: منہ، ناک اور دو آنکھیں۔ اگر یہ اعضا باہم متناسب ہوں تو خوبصورتی پیدا ہوتی ہے ورنہ بدصورتی نمایاں ہوتی ہے، انسان کی انگلیوں کو کس طرح پتلا بنایا۔ انگلی میں تین تین پورے رکھے جو نہایت باریک بینی کے ساتھ باہم جوڑے گئے۔ پھر ان کی گرفت کو ایسا مضبوط بنایا کہ ہر قسم کے آلات کو انسان کے لیے پکڑنا آسان ہو گیا ہے۔ ایسے حیوانات اور پرندوں کے اعضا میں ایک تناسب اور ہم آہنگی رکھی۔ ایسے ہی نباتات

کے داخلی اجزاء میں اختلاف عناصر کے ذریعہ انسان کے لیے بہت سے فوائد ودیعت کر دیئے اور ان کے عناصر میں اس صانع عالم نے ایک حکیمانہ مقدار کے مطابق ایک تناسب رکھا۔ چنانچہ جس طرح ہاتھوں کی ہڈیوں اور پوروں میں ایک متناسب اندازہ اور نظام نہ ہوتا تو اس کے مطلوبہ فوائد ظاہر نہ ہوتے، اسی طرح نباتات کے اجزاء میں بھی اگر ''تسویہ'' نہ ہوتا تو اور نباتات کا نظام بھی دگرگوں ہو جاتا۔ (۱۹)

امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں کچھ اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں کہ حیوانات میں اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کو اس کی ضرورت کے مطابق مناسب اعضاء اور آلات وحواس عطا فرمائے۔ اور نہ صرف حیوانات کو بلکہ اس کائنات کی ہر شی اور ہر مخلوق کو اپنی مشیت کے مطابق بغیر کسی انتشار واضطراب کے نہایت درجہ محکم طریقے پر پیدا فرمایا۔ (۲۰)

حق تعالیٰ شانہ نے اس حکمت بالغہ کے تحت جو تمام سائنسی اور غیر سائنسی علوم کی حیرت انگیز مباحث کا تذکرہ ہے، اس کو قرآن حکیم کی ایک آیت میں اختصار کے ساتھ کچھ یوں بیان کیا گیا:

﴿انا کل شئی خلقناہ بقدر﴾ (۲۱)

ترجمہ:- ''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک خاص اور متعین انداز سے پیدا کیا۔''

تسویہ کا نظام جس طرح عالم حیوانات اور عالم نباتات پر صادق آتا ہے، اسی طرح عالم جمادات اور عالم افلاک پر بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ءَ اَنتم اشد خلقاً أم السماء، بَنٰهَا، رفع سمکها فسوها﴾ (۲۲)

ترجمہ:- ''(اے انسانو!) تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ جس کو اس نے بنایا، اس کی چھت کو اونچا کیا، پھر اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔''

نظام تقدیر:

اس سلسلہ میں تیسری چیز نظام تقدیر ہے یعنی اس نے تمام مخلوقات کے لیے ایک طبعی نظام مقرر کیا ہے اور پھر ہر ایک کو اس نظام کے مطابق کام کرنے اور اپنی زندگی گزارنے کی توفیق بھی عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿وخلق کل شئی فقدرہ تقدیراً﴾ (۲۳)

ترجمہ:- ''اور اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کا ایک اندازہ مقرر کیا۔''

امام راغب نے اپنی کتاب میں اس لفظ کے معنی یوں بیان فرمائے ہیں:

''القدر والتقدیر کے معنی کسی چیز کی کمیت کو بیان کرنے کے ہیں، اور تقدیر کا ایک معنی طاقت اور قدرت عطا کرنا بھی ہے۔ پس تقدیر الٰہی کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا قدرت و طاقت عطا کرنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو مقدار مخصوص اور طرز مخصوص پر بنانا جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ اس لیے کہ فعل الٰہی دو قسم پر ہے۔ اول ایجاد بالفعل یعنی ابتداء ہی سے کسی شی کو ایسا کامل وجود عطا کرنا کہ جب تک مشیت الٰہی اس کے فنا یا تبدیل کی مقتضی نہ ہو اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جیسے اجرام سماویہ اور اس میں موجود اشیاء کی تخلیق کہ ان میں تا قیامت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اصول اشیاء کو بالفعل اور ان کے اجزاء کو بالقوۃ وجود عطا فرمانا اور ان کو اس اندازہ کے ساتھ مقدر کرنا کہ اس کے خلاف ظہور پذیر نہ ہو سکیں جیسا کہ کھجور کی گٹھلی کے متعلق تقدیر الٰہی یہ ہے کہ اس سے کھجور کا درخت ہی اگتا ہے اور سیب اور زیتون کا درخت نہیں اگ سکتا۔ اسی طرح انسان کی مادہ منویہ سے انسان ہی پیدا ہوتا ہے دوسرے جانور پیدا نہیں ہو سکتے۔'' (۲۴)

ان معنوں کی رو سے سورۃ الفرقان کی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ''وہ ہر ایک مخلوق اور ہر ایک نوع کا ایک مخصوص طبعی قانون مقرر کرتا ہے اور پھر اس قانون طبعی کے مطابق اس کو زندگی کے اس میدان میں جدوجہد کرنے کی پوری قدرت اور صلاحیت بھی حاصل ہوتی ہے۔'' چنانچہ تقدیر کا یہ نظام نہ صرف حیوانات اور نباتات میں جلوہ گر ہے بلکہ سماوات، کواکب، عناصر، جمادات اور دوسری تمام مخلوقات میں جاری و ساری ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وجعل الیل سکناً والشمس والقمر حسباناً، ذالک تقدیر العزیز العلیم﴾ (۲۵)

ترجمہ:- ''اور اس نے رات کو باعث سکون بنایا اور شمس و قمر کا ایک حساب مقرر کیا۔ (ان دونوں فلکی اجرام کا کام ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا مقرر کیا ہوا ضابطہ ہے۔''

قرآن حکیم میں ایک عمومی ضابطے کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

﴿وقد جعل اللّٰہ لکل شئی قدراً﴾ (۲۶)

ترجمہ:- ''اور اللہ نے ہر شی کا ایک ضابطہ بنا رکھا ہے (جس کے تحت وہ اپنا کام کرتی ہے)۔''

یہی وجہ ہے کہ تمام مظاہر کائنات اور زمین و آسمان کی ہر شی ایک مضبوط ضابطے میں جکڑی ہوئی ہے جس کو مذہب کی زبان میں ''تقدیر'' اور سائنس کی زبان میں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہتے ہیں۔

نظام ہدایت:

نظام تقدیر کے بعد اب چوتھی چیز نظام ہدایت ہے۔ یہ وہی ہدایت ہے جس کے بارہ میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿قال ربنا الذی اعطیٰ کل شی خلقه ثم هدی﴾ (۲۷)

ترجمہ:- ''کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شی ۔'' کو خلقت عطا فرمائی اور پھر اس کو ہدایت (راہ نمائی) دی۔''

ہدایت کا مفہوم یہاں نہایت وسیع معنوں میں ہے یعنی مخلوقات کی ہر نوع کو اس کے مخصوص طبعی قانون اور ضابطے کے مطابق اس کی راہ نمائی کرنا بھی اس رب تعالیٰ کا کام ہے۔ اور یہ مخصوص نوعی قانون ہر مخلوق کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے پوری طرح ودیعت کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے خلاف نہ کر سکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں ''خلق'' کے ساتھ جو ہدایت کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد وہ مرتبہ ہدایت ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی راہیں کھولتا ہے، انہیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریات زندگی کی طلب وحصول میں راہ نمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت دراصل ربوبیت کی ہدایت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس ہدایت کو ''ہدایت وجدان'' کا نام دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''وجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے، اور وہ باہر کی راہ نمائی و تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا۔ جونہی شکم مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے، اور جب پستان منہ میں لیتا ہے تو جانتا ہے کہ اسے زور زور سے چوسنا چاہیے۔ بلی کے بچوں کو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوش محبت میں انہیں چاٹ رہی ہے۔ وہ اس کے سینہ پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے۔ جسے خارج کے مؤثرات نے چھوا تک نہیں، کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لے لینا چاہیے، اور اس کی غذا سرچشمہ یہیں ہے۔ وہ کون سا فرشتہ ہے جو اس وقت اس کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کر لے۔ یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے اور یہی وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس وادراک کی روشنی نمودار ہو، ہر مخلوق کو اس کی پرورش اور زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔'' (۲۸)

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ اس بارے میں ایک مزید مثال دے کر اس بات کی مزید وضاحت فرماتے ہیں:

''تمہارے گھر میں پلی ہوئی بلی ضرور ہوگی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے۔ اس حالت کا اسے کوئی پچھلا تجربہ نہیں، تاہم اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ تیاری اور حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں۔ جونہی وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے، خود بخود اس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مضطرب الحال بلی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے۔ پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچہ دیتی ہے۔ پھر یکا یک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ غور کرو، یہ کون سی قوت ہے جو بلی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ محفوظ جگہ تلاش کرے کیونکہ عنقریب ایسی جگہ کی اسے ضرورت ہوگی۔ یہ کون سا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلا بچوں کا دشمن اور ان کی بو سونگھتا پھرتا ہے، اس لیے جگہ بدلتے رہنا چاہیے۔ بلاشبہ یہ ربوبیت الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جو ان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔'' (۲۹)

اس سلسلہ میں اور بھی بے شمار مثالیں اس کائنات میں بکھری پڑی ہیں، چنانچہ امریکہ کے ایک نامور سائنس دان کریسی مورلین (Cressy Morrison) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے Man Does not Stana alone۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا صلاح الدین احمد نے ''خدا ہمارے ساتھ ہے'' کے نام سے کیا ہے۔ اس کتاب کے آٹھویں باب میں ''حیوانی جبلتیں'' کے عنوان سے بہت سے بصیرت افروز واقعات لکھے ہیں۔ مورلین نے لکھا ہے:

''مرغابیاں ہر موسم سرما میں شمالی برفستانوں سے پرواز کرتی اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے اڑتی ہوئی ہمارے میدانوں میں پہنچ جاتی ہیں، اور ہماری جھیلوں اور تالابوں کے نیستانوں میں سردیاں بسر کر کے موسم بہار آتے ہی اپنے وطنوں کا رخ کر لیتی ہیں۔ اور کیا مجال کہ اس دور دراز سفر میں کہیں گز بھر بھی ادھر ادھر جائیں۔ کچھ یہی کیفیت پیغام رساں کبوتروں کی ہے۔ آپ ایسے کسی کبوتر کو پنجرے میں بند کر کے موٹر یا ریل کے ذریعے سینکڑوں میل دور لے جائیں۔ جب آپ اسے چھوڑیں گے تو وہ فضا میں دو چار چکر لگائے گا۔ گویا اندازہ کر رہا ہے کہ میں کہاں ہوں، اور پھر تیر کی طرح اپنے گھر کا رخ کرے گا اور سیدھا وہیں پہنچ جائے گا۔ یہ اس کی جبلت اور ہدایت وجدانی ہے، اور یہی چیز شہد کی مکھی کو اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے کہ اپنے چھتے سے نکل کر دور دور تک پھولوں کے رس کی تلاش میں جاتی ہے اور سیدھا اپنے ٹھکانے پر لوٹ آتی ہے۔'' (۳۰)

اس سلسلہ میں مصنف نے دو مثالیں اور پیش کی ہیں وہ بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔

''سامن مچھلی سالہا سال سمندر میں بسر کرتی ہے، لیکن جب اس کے بعد وطن جانے کا وقت آتا ہے تو وہ کسی دریا کے دہانے کا رخ کرتی ہے وراس کے تیز دھارے کا مقابلہ کرتی ہوئی برابر اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے، اور پھر صدہا میل کا سفر طے کر کے اس ندی کی طرف مڑ جاتی ہے جہاں وہ اصل میں پیدا ہوئی تھی۔ یہاں بھی دائیں کنارے کی متوطن سامن کبھی بائیں کنارے کی طرف نہیں جائے گی خواہ اس کے اپنے کنارے پر ہزاروں جال اور کنڈیاں کیوں نہ لگی ہوئی ہوں۔ جب کہ دوسرا کنارہ کسی قانون کے باعث ان بلاؤں سے محفوظ ہو۔ آخر وہ کیا چیز ہے جو سامن کو عین ٹھکانے پر لے جاتی ہے؟ اور بار ہا یہ بات دیکھی گئی ہے کہ دریا کے الٹے رخ سفر کرتے ہوئے اگر یہ مچھلی کبھی غلطی سے کسی دوسری ندی کی طرف مڑ گئی ہے تو غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ فوراً لوٹے گی اور صحیح موڑ آنے پر اپنی ندی ہی میں داخل ہوگی اور وہیں اپنی منزل مقصود اور مقدر معلوم تک پہنچے گی۔''(۳۱)

''اہل مچھلی (ELL) کا معاملہ اس سے بھی پیچیدہ تر اور حیرت زدہ ہے۔ یہ عجیب وغریب مخلوق دریاؤں اور اس کے کنارے کی جھیلوں میں شباب کو پہنچتی ہے اور پھر دین کے ہر مقام سے ایک ہی منزل یعنی جنوبی برمودا کا رخ کرتی ہے۔ یورپ سے برمودا کے جزائر ہزار ہا میل دور ہیں لیکن وہ طویل سفر ضرور طے کرے گی اور شمالی ملکوں سے جنوبی سمندروں کی لاانتہاء گہرائیوں میں پہنچے گی۔ یہاں پہلے وہ بچے دے گی اور پھر مر جائے گی۔ اور اس کے یہ بچے جو اردگرد بحر ناپید کنار کی خوف ناک ویرانیوں کے سوا کچھ نہیں پاتے' پھر سے ان ساحلوں کا رخ کر لیتے ہیں جہاں سے ان کے ماں باپ آئے تھے اور وہاں پہنچ کر اپنی ندی یا جھیل یا تال کی راہ پکڑ لیتے ہیں اور اپنے وطنوں کو جا آباد کرتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے میں نہ جانے وہ کتنے طوفانوں کو عبور کرتے' کتنے بھنوروں میں سے بچ کر آگے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جس کی طرف محض ایک اشارہ غیب اور ہدایت وجدانی ان کی راہنمائی کرتی ہے..... لیکن کوئی امریکی ایل کبھی یورپ کے سمندروں میں نہیں پائی گئی اور نہ کوئی یورپی ایل کبھی امریکی پانیوں میں نظر آئی۔ یہ دونوں نسلیں برمودا میں ضرور جمع ہوتی ہیں' لیکن جب ان کے بچے وہاں سے لوٹتے ہیں تو تیر کی طرح اپنے ہی نشانے پر پہنچتے ہیں''۔ (۳۲)

یہی مصنف اپنے ایک اور مضمون میں لکھتا ہے:

''ایک بھڑ ایک ٹڈی کو اپنے ڈنگ سے بے بس کر لیتی ہے۔ پھر زمین میں ایک سوراخ کھودتی

ہے۔ ٹڈی کو ٹھیک جگہ پر ڈنگ مارتی ہے تا کہ وہ بیہوش تو ہو جائے لیکن مر نہ جائے اور محفوظ گوشت کی صورت میں زندہ رہے۔ پھر بھڑ سلیقے کے ساتھ انڈے دیتی ہے تا کہ اس کے بچے انڈوں سے نکل آئیں تو ٹڈے کو مارے بغیر اسے کھا سکیں۔ ان کے واسطے مرے ہوئے ٹڈے کا گوشت مہلک ہوتا ہے۔ پھر ماں وہاں سے اڑ جاتی ہے، اور باہر جا کر مر جاتی ہے اور واپس آ کر کبھی اپنے بچوں کو نہیں دیکھتی۔ یہ پراسرار ترکیبیں سیکھنے سکھانے سے نہیں آ یتیں بلکہ یہ فطرت میں سمو دی جاتی ہیں اور اس کو قرآن کی اصطلاح میں ''ہدایت'' کہا گیا ہے۔''(۳۳)

ان مثالوں کے علاوہ اور بھی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن ان کو طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں تکوین وجود کے مراتب اربعہ۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت نے جس طرح مخلوقات کو ان کے مناسب حال جسم وقویٰ دیئے اسی طرح ان کی ہدایت کا فطری سامان بھی مہیا کر دیا۔ فطرت کی یہی وہ ہدایت ہے جو ہر وجود کو زندگی اور معیشت کی راہ پر لگاتی اور ضروریات زندگی کی جستجو میں راہ نما ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے جابجا اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے کہ ہر وجود کے بننے اور درجہ تکمیل تک پہنچنے کے مختلف مراتب ہیں اور ان میں آخری مرتبہ ''ہدایت'' کا مرتبہ ہے۔ جس کو سورۃ الاعلیٰ میں یوں بیان فرمایا:

﴿الذی خلق فسویٰ، والذی قدر فھدیٰ﴾ (۳۴)

ترجمہ:- ''وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اسے درست کیا، پھر ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔''

یعنی تخلیق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ یہ تکوین وجود کے چار مراتب ہیں۔

(۱) تخلیق کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ بات کائنات کی خلقت اور اس کے ہر وجود کا مواد عدم سے وجود میں آ گیا۔

(۲) تسویہ کے معنی ہیں کہ ہر ایک کو جس طرح ہونا چاہیے، ٹھیک ٹھیک اسی طرح درست اور آراستہ کر دینا۔

(۳) تقدیر کے معنی اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

(۴) ہدایت سے مقصود یہ ہے کہ وجود پر اس کی زندگی و معیشت کی راہ کھول دی جائے۔

تکوین وجود کے ان مراتب اربعہ کو سائنس کی اصطلاح میں بیالوجی (Biology) کہتے ہیں اور آج یہ سائنس کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ حیاتیات (Biology) کی پھر دو بڑی شاخیں ہیں:

علم نباتات (Botany) علم حیوانات (Zoology)

پھران میں سے ہرایک کی کئی شاخیں ہیں جن کا اس وقت بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ بہرحال بیالوجی کا مطلب ہے The Seience of Life یعنی زندگی کا علم اور زندگی کے اسی علم سے پھر کئی طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ یہاں آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سائنس ہے کیا چیز؟ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ قرآن حکیم میں جو بات نظری طور پر کی گئی ہے کائنات اس کے حق میں واقعاتی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے پوری سائنس قرآن حکیم کا علم کلام ہے کیونکہ سائنس کسی سائنس دان کے خودساختہ علم کا نام نہیں بلکہ وہ خدا کی کائنات میں کام کرنے والے قوانین کی تلاش اور انکشاف کا نام ہے۔ ان قوانین کا جو حصہ بھی سائنس دریافت کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کارروائیوں کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں (آیات) میں سے ایک نشانی کا انسانی علم میں آنا ہوتا ہے۔ ایک سائنس دان کے لیے سائنس کا علم برائے تعمیر دنیا یا برائے تخریب دنیا ہوتا ہے جب کہ ایک مومن کے لیے سائنس ایک ایسا علمی ہتھیار ہے جس سے وہ اپنی بات کو مدلل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنی مختلف آیات میں کائنات میں فطرت کی جو قوتیں کارفرمائی ہیں، انسان کو اس سے روشناس کرایا اور انسان کو اصول فطرت سے آشنائی بخشی۔ قرآن نے تفقہ، تدبر، تفکر اور تعقل کی دعوت دی۔ اس طریقہ سے قرآن نے انسان کے ہاتھ میں قدرت کے خزانے کی چابی سونپ دی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک یورپی مفکر لکھتا ہے کہ:

''ساتویں صدی عیسوی میں دنیا ایک نہایت مصیبت سے دوچار تھی بلکہ بادشاہوں کے جبر وستم سے کراہ رہی تھی۔ عربوں کی فتوحات نے ان میں ایک نیا ولولہ اور نیا خون داخل (Infused) کیا..... محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عربوں کو قرآن دیا جو نئے کلچر کا نقطۂ آغاز تھا۔ (۳۵)

انسانی ترقی کا نقطۂ آغاز فطرت کی قوتوں کو انسان کی ضروریات کے تحت کرنا ہے اور اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے سائنسی علوم کا انکشاف کیا۔ اسلام کے ایک مسئلہ توحید نے فطرت کے ان تمام مظاہر کو مسخر کیا کیونکہ شرک عالم فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا کیونکہ شرک کے عقیدہ کے تحت مظاہر فطرت پوجنے کی چیز بنے ہوئے تھے کہ تحقیق کی چیز۔ مشرک انسان آفتاب وماہتاب کو دیوتا سمجھتا تھا اس وجہ سے وہ کسی صورت بھی اس کو اپنی تحقیق کا ہدف نہیں بنانا چاہتا تھا، لیکن جب دنیا میں توحید کا غلبہ ہوا تو مسلمانوں نے ان مظاہر فطرت پر تحقیق شروع کی اور سائنس وجود میں آئی۔ اس میں شک وشبہ نہیں کہ اسلام اس لیے نہیں آیا کہ دنیا کو سائنس دے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسان پر نہ کھلتا۔

گذشتہ سطور میں اختصار کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ موجودہ سائنس خواہ اس کا تعلق حیوانات سے ہو یا نباتات سے، کیمسٹری سے ہو یا فزکس سے، اس کی اصل اور بنیاد قرآن حکیم ہے اور قرآن حکیم نے اس کے مبادیات اور اصول وضوابط اپنی مختلف آیات میں ذکر کیے ہیں جن کو ایک ماہر فن بخوبی جان سکتا ہے۔ ویسے بھی اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو سائنس اس فکری انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جو اسلام کی توحید کی بنیاد پر واقع ہوا۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور میں دمشق میں ہوا اور اسلام میں سب سے پہلا سائنس دان خالد بن یزید بن معاویہ اموی ہے جس نے کیمسٹری کو ایک طبعی علم کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ پھر عباسی دور میں اس شعبہ نے بغداد میں عروج حاصل کیا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ میں بغداد میں بیت الحکمت قائم ہوا جس نے سائنس کے مختلف شعبوں میں تحقیق کے فرائض انجام دیئے۔ المامون خود بھی ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اس زمانہ میں اس وقت کے ہیئت اور جغرافیہ کے عالموں نے زمین کا گول ہونا ثابت کیا اور زمین کے محیط کو معلوم کیا جو کہ ۲۰۴۰۱ میل تھا جب موجودہ زمانہ میں اس کی صحیح ترین پیائش ۲۵ ہزار میل ہے۔ مسلمانوں نے قرون وسطیٰ میں سائنس کے کس کس میدان میں ترقی کی، اس کے لیے ملاحظہ ہو پروفیسر ہٹی کی کتاب تاریخ عرب (History of The Arals) اور حکیم محمود احمد ظفر کی کتاب اسلام اینڈ سائنس (Islam and Science)

بغداد سے سائنس کا یہ علم منتقل ہو کر اندلس یعنی اسپین میں گیا اور وہاں کی مسلمان حکومتوں کی سرپرستی میں اس علم نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان علم کے اس میدان میں استادی کے مقام پر رہے۔ لیکن اس کے بعد یورپ نے سائنس میں جو ترقیاں کیں اس نے مسلمانوں کو شاگردی کے مقام پر پہنچا دیا۔ خود مغربی علماء اور دانشوروں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ جس وقت یورپ غفلت کی نیند سو رہا تھا، اسلامی ممالک اس وقت جاگ رہے تھے اور سائنسی علوم کی روشنی میں ترقی کی راہ میں تیز تیز منزلیں طے کر رہے تھے۔ چنانچہ یورپ کا ایک مصنف ہرن شا (Hearnshaw) نے لکھا ہے:

''دسویں صدی عیسوی اور اس کے مابعد زمانہ میں یورپ کے لوگوں کا تعلق مشرق کی فردست سے ہو جاتا ہے۔ ان صدیوں میں جو نسبت آج مشرق اور مغرب کی ہے ہم اس کے برخلاف پاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اکثر مشرقی اقوام مغربی تمدن کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتی ہیں اور اس کا اظہار تہ دل سے نہایت خوشامدانہ طریقہ سے کرتی ہیں۔ مشرق کا باشندہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سائنس، علم، حکمت، تنظیم اور پبلک اسپرٹ مغرب میں پائی جاتی ہے۔ دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے یورپ میں صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی۔ مغرب کے باشندے کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اسلام کے پاس معارف اور عہد

قدیم کی سائنس ہے۔ اسلام کے اسلحہ اور نظم ونسق کی فضیلت وعظمت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی۔''(۳۶)

مسلمانوں سے ربط وتعلق پیدا ہونے سے قبل یورپ کی حالت کیا تھی؟ اس کا جواب یہی ہے کہ نہایت ناگفتہ بہ تھی، وہی وحشیانہ زندگی، وہی جنگلی طریق رہائش، نہ تمدن کا نام اور نہ تہذیب کا اثر۔ چنانچہ یورپ کے ایک نامور دانشور ڈریپر (Draper) نے اس حالت کا کچھ نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''یورپ کے وحشی باشندے ابھی اپنی وحشیانہ حالت سے ذرا بھی بلند نہ ہوئے تھے۔ ان کے بدن غلیظ، ان کے ضمیر غیر متمدن۔ وہ ایسی جھونپڑیوں میں رہتے تھے کہ اگر ان کے فرش پر گھاس اُگ رہی ہو اور دیواروں پر پھوس کی چٹائیاں لگی ہوئی ہوں تو یہ بات ثروت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ان کی خوراک حقیر سی تھی مثلاً سیم، آڑو، جڑیں اور درختوں کی چھالیں بھی وہ کھانے میں استعمال کرتے تھے۔ ان کا لباس کیا تھا؟ جانوروں کا کچا چمڑا، بہت ہوا تو پکائی ہوئی (Tanned) کھالیں پہن لیں۔ پائیداری ہوسکتا ہے کہ کھالوں کو دوامی حیثیت حاصل ہو مگر ذاتی پاکیزگی میں یہ کس طرح بھی ممد ومعاون نہیں ہوسکتیں۔ شاہی شوکت کے لحاظ کے اظہار کے لیے یہ کافی سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ کی سواری ایک بیل گاڑی پر مشتمل ہو جس کے سامنے بیلوں کی کم از کم دو جوڑیاں لگی ہوں۔ ان بیلوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے غلام آنکس لیے پیادہ پا ساتھ چلتے تھے جن کی ٹانگوں پر پرال کے پولے بندھے ہوئے ہوتے تھے۔ ان لوگوں کا ایمان دوگاہوں کے معجزوں کی بے سروپا داستانوں اور لغو تبرکات میں بہت پختہ تھا۔ مذہب میں ابتذال پیدا ہو چکا تھا۔ ہوس پرست مذہبی راہ نما جب جاہ کی تلاش میں بحث مباحثوں میں مصروف رہتے تھے۔''(۳۷)

یہ تو ان کی تمدنی اور تہذیبی گراوٹ تھی جس کو ڈریپر کے حوالہ سے ٹاؤنر نے بیان کیا ہے۔ پھر اس زمانہ میں رہبانیت نے ان پر اتنا غلبہ حاصل کیا ہوا تھا کہ آج اس کا تصور کرتے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی رہبانیت کا کچھ نقشہ لیکی (Lecky) نے اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ میں پیش کیا ہے:(History of European Morals)

''راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد مورخین کے اختلاف بیان کی وجہ سے قطعی طور پر نہیں بتائی جا سکتی، تاہم ان کی کثرت اور تحریک رہبانیت کی اشاعت ومقبولیت کا اندازہ اعداد ذیل سے ہوسکتا ہے۔ سینٹ جروم کے زمانہ میں ایسٹر کی تقریب پر تقریباً پچاس ہزار راہبوں کا مجمع ہوتا تھا۔ چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے سینٹ سرابین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے۔ اور چوتھی صدی کے

خاتمہ پر تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی، قریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی۔ دو چار سال نہیں پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی۔ مورخین نے اس کی بڑی لرزہ خیز داستانیں اور مثالیں پیش کی ہیں۔ سینٹ میکیریس اسکندروی کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا تا کہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں۔ نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے، اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے۔ ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے۔ اس مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے۔ جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے۔ بعض راہب کسی قسم کا لباس نہیں استعمال کرتے تھے۔ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پاؤں کے بل چلتے تھے۔ راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے۔ اہل زہد کا ایک گروہ صرف گھاس کھاتا تھا۔ جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی، اور جو زاہد مرتبہ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمۂ عفونت وغلاظت ہوتے۔ سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا تھا کہ سینٹ انٹونی بابن کبرستی کبھی مدت العمر اپنے پاؤں دھونے کے گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ سینٹ ابراہام نے پچاس سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرہ یا پاؤں پر پانی کی چھیٹ نہیں پڑنے دی۔ راہب الیگزنڈر بڑے تاسف اور تحیر سے فرماتے ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام سمجھتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں۔ راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے۔ والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا۔ جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی، اس کے نام پر پبلک میں ہر طرف واہ واہ ہوتی اور تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے تھے۔ پہلے جو اثر واقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ پادری رہبانیت کے لیے لڑکوں کو اغوا کرتے تھے۔ سینٹ ایمبروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اسے دیکھ کر مائیں اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کر لیتی تھیں۔ تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی اور جواں مردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پا گئے، مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت و جرأت کہ عابدان مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے۔ دوسرا اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشرت کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزا کا احترام وادب حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ اس زمانہ میں ماں باپ کے

ساتھ احسان فراموشی اور اعزاء کے ساتھ قساوت قلبی کی جس کثرت سے نظیر ملتی ہیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ زاہدانِ صحرا اور عابدانِ مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے۔ بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انہیں بے والی وارث محض دوسروں کے ٹکڑوں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ ان کا مقصد زندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انہیں نجات اخروی حاصل ہو۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین اور متوسلین جئیں یا مریں۔ لیکی (Lecky) نے اس سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کے سایہ سے وہ بھاگتے تھے۔ ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے۔ اپنی ماؤں، بیویوں اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیت کبیرہ سمجھتے تھے۔ لیکی (Lecky) نے اس سلسلہ کے جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کبھی ہنسی آتی ہے تو کبھی رونا۔'' (۳۸)

ایک طرف تو زہد اور رہبانیت تھی جو صحراؤں میں گوشہ نشین تھی اور شہری زندگی میں ان کا کوئی اقتدار نہ تھا لیکن اس کے برعکس فسق و فجور کی تحریک شہروں میں اپنے پورے جوش و تلاطم پر تھی۔ لیکی (Lecky) اس اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

''اخلاق میں انحطاط، رکاکت اور پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی، بلکہ بعض شہروں میں جن میں سب سے زیادہ کثیر تعداد میں زہاد اور راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ جمہور کی رائے اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی اور رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا، البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغابازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم و تشدد، شقاوت اور بے حیائی اتنی نہ تھی لیکن اس کے ساتھ حریت فکر، آزاد خیالی اور جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔'' (۳۹)

ان تمام خرابیوں کے ساتھ ساتھ گیارہویں صدی عیسوی میں حکومت اور کلیسا کی کشمکش شروع ہو گئی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی شدت اختیار کر لی۔ شروع میں تو پوپ کو ایک جنگ میں فتح ہوئی اور پوپ کا

اعزاز واقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ بادشاہ ہنری چہارم ۱۰۷۷ء میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ کانوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو۔ چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا۔ پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی سفارش پر اس کو اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے پاؤں اون پہنے ہوئے آیا پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے بصد مشکل اس کی غلطی معاف کی۔ اس کے بعد حکومت اور کلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کو فتح اور کبھی شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ انجام کار حکومت کے مقابلہ میں کلیسا کو دبنا پڑا۔ اس پوری مدت کشمکش میں عوام مذہب وسیاست اور کلیسا وریاست کی دہری غلامی میں گرفتار تھے۔

عیسائی دنیا اور یورپ کی حالت کا یہ ایک مختصر سا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری طرف اسلامی شوکت وتہذیب کی حالت دیدنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر چودھویں صدی تک مسلمانوں نے مختلف علوم ومعارف کے میدان میں قدم بہت آگے بڑھائے۔ قدیم علوم کو پڑھا، سیکھا اور سمجھا، تصنیف کیا، تجربات کیے اور پھر ان سے نئی اختراعات پیدا کیں۔ اس کے بعد تازہ ایجادات کا زمانہ آیا۔ اسلامی اسپین کے دماغوں نے علوم وفنون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدانخواستہ عہد قدیم اور عہد جدید کے درمیان عہد اسلامی کڑی نہ آ جاتی تو دور حاضر میں اس ترقی کا موجود ہونا، جو ہم آج دیکھتے ہیں، ناممکن تھا۔ مسلمانوں نے نہ صرف قدیم علوم ہی کو پروان چڑھایا اور انہیں فنا ہونے سے بچا لیا بلکہ ان کو صیقل کیا، ان میں نئی نئی اختراعیں کیں اور آنے والی نسلوں کے سپرد اس تمام علم کے ذخیرے کو کر دیا جس کے سبب سے موجودہ نسلیں اس ترقی کی معراج تک پہنچ سکیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ یورپ میں یہ اسلامی علوم ومعارف کیسے پہنچے۔ ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسپین اور یورپ کے دوسرے ممالک کے مابین جب لوگوں کی آمد ورفت کا تبادلہ ہوا اور یورپ کے لوگ اسپین کے مسلمانوں کی ذہنی حریت اور ان کے علوم وفنون سے آشنا ہوئے تو ان میں بھی حریت فکر کا جنون پیدا ہوا بلکہ جس طرح آج ہم یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، اس زمانے میں یورپ کے لوگوں نے غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ کی یونیورسٹیوں میں چوری چھپے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا شروع کیا۔ چوری چھپے اس لیے کہ پادری صاحبان اور ارباب کلیسا نہیں چاہتے تھے کہ یہ لوگ علم وفن کی وادیوں میں گامزن ہوں اور عقل وشعور کے جذبات ان میں ابھریں، لیکن انسانی جذبات کو بزور کب تک دبایا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں یورپ میں عقلیت کا کوہ آتش فشاں پھٹ گیا۔ علماء طبیعات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے اور ارباب کلیسا کے بے اصل نظریات کی تردید کرنی شروع

کردی۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) کی پروٹسٹنٹ کی تحریک بھی اسپین سے حاصل کردہ حریت فکر کی وجہ سے تھی کیونکہ یہ بھی قرطبہ کی یونیورسٹی سے پڑھ کر آیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے جن لوگوں کو اسپین کی مسلم دنیا کے علم وفن کی ہوا لگی انہوں نے اہل کلیسا کے بے اصل اور بے بنیاد نظریات کی تردید کرنی شروع کردی جو جغرافیہ اور تاریخ اور طبیعات سے متعلق ان کی مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے، اور بڑی جرأت، جسارت اور آزادی کے ساتھ ان کی علمی تنقید اور بے سمجھے ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے علمی انکشافات اور تجربوں کا بھی اعلان کر دیا۔ ان کا یہ اعلان کرنا تھا کہ مذہبی حلقوں اور ارباب کلیسا نے جو اس وقت اقتدار اور طاقت کے مالک تھے، ان کی تکفیر کی اور دین مسیحی کے لیے ان کے خون بہانے اور ان کے مال ومتاع کو ضبط کر لینے کی اجازت دی۔ پورے یورپ میں احتساب کی عدالتیں قائم ہوگئیں جو پوپ کے بقول ان ملحدوں اور مرتدین کو سزادیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا۔ اس کے جاسوس براعظم کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارہ میں محکمہ احتساب نے تفتیش اور تجسس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایک عیسائی عالم کہتا ہے کہ ''ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں جن میں سے ۳۲ ہزار کو زندہ جلایا گیا۔ (۴۰)

ان زندہ جلائے جانے والے لوگوں میں ہیئت وطبیعات کا مشہور عالم برونو (Brunoe) بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کر دیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو (Galileo) کو بھی اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ سورج کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ اہل کلیسا نے پہلے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے اس عقیدہ سے توبہ کرے۔ چنانچہ اس نے ان الفاظ میں توبہ کی

"I, Galileo, Being in my Seventieth Year, being a prisoner on my Knees befor Year emixences, having before my eyes the Holy Goshel, abyure curse and detst the error and the heresy of the movement of the Earth"

لیکن اس توبہ نامہ کے باوجود بھی اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

گلیلیو کو گردش زمین کے اس عقیدہ پر کیوں سزا دی گئی؟ وجہ یہ تھی کہ اس کا یہ عقیدہ مسیحیت کے خلاف تھا۔ قدیم یونان میں زمین اور سورج کی گردش کے بارہ میں دو نظریے پیش کیے گئے تھے۔ ایک نظریہ ارسٹارکس کا نظریہ تھا جس مین زمین کو سورج کے گرد گھومتا ہوا بتایا گیا تھا۔ دوسرا نظریہ ٹالمی کا نظریہ تھا جس کے مطابق سورج زمین کے گرد گھوم رہا تھا۔ ارسٹارکس کے نظریہ کے مطابق زمین بظاہر گول تھی اور دوسرے نظریہ کے مطابق زمین چپٹی تصور کی گئی تھی۔ تیسری صدی عیسوی میں جب قسطنطین نے عیسائیت قبول کی اور عیسائیوں کو یورپ میں غلبہ حاصل ہوا تو انہوں نے ٹالمی کے نظریہ کی سرپرستی کی جس میں سورج زمین کے گرد گھومتا تھا اور دوسرے نظریہ کو بزور دبایا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عیسائیت نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا فرض کر لیا تھا اور اس عقیدہ کے مطابق زمین کو یہ تقدس حاصل تھا کہ وہ خدا کی جنم بھومی ہے، اور جو کرہ خدا کی جنم بھومی میں ہو وہ کسی دوسرے کرہ کا تابع (Satellite) کس طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ٹالمی کے اس نظریہ کو مذہب کا ایک حصہ بنا دیا۔ گلیلیو نے چونکہ اس کے خلاف نظریہ پیش کیا لہٰذا مذہب کا مخالف اور ملحد سمجھتے ہوئے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کے لیے ملاحظہ ہو ڈریپر کی کتاب ''مذہب اور سائنس کا تصادم'' (۴۱)

اہل کلیسا کے اس ظلم و تشدد نے ان دانشوروں اور روشن خیال لوگوں کے پیمانہ صبر کو لبریز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف اہل کلیسا بلکہ مذہب کے خلاف ہی علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ جذبۂ بغاوت نے بعد میں علم و دین کی باہمی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اور علوم و عقلیت کے علم برداروں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ علم و مذہب ایک دوسرے کی ضد اور حریف ہیں جو کبھی بھی جمع نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ان لوگوں کے سامنے جب بھی مذہب کا نام آتا تو دفعتاً اہل کلیسا اور مذہب کے علم برداروں کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور ان بے گناہ علماء اور روشن خیال لوگوں کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنہوں نے انتہائی مظلومیت کی حالت میں مذہب کے ان جلادوں کے ہاتھوں پر اذیت موت پائی۔ مذہبی گروہ اور اہل کلیسا کے نام سے ان کی نگاہوں کے سامنے پر غضب چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، شعلے برساتی ہوئی آنکھیں، تنگ ذہن اور پادریوں کے بھدے دماغ آتے۔ چنانچہ مذہب سے نفرت کو انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اصول بنا لیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نفرت و حقارت اور کراہیت و ناپسندیدگی کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

اہل کلیسا اور روشن خیال لوگوں کے اس باہمی تصادم نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جس میں ان کے

ذہنی نظام میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ چنانچہ ایک نومسلم محمد اسد نے اس بارے میں لکھا ہے:

''مغربی تہذیب صاف لفظوں میں اور پرزور طریقہ پر تو خدا کا انکار نہیں کرتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذہنی نظام میں خدا کی کوئی جگہ نہیں اور اس کے ماننے میں وہ کوئی فائدہ محسوس کرتی ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے۔'' (۴۲)

یورپ میں اسلامی علوم کیسے پہنچے؟

اب آخر میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اسلامی علوم یورپ میں کیسے پہنچے؟ اور وہ کیا ذرائع تھے جن سے یہ علوم سرزمین یورپ میں داخل ہوئے۔ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ جب یورپ کے ایک حصہ اندلس (اسپین) میں اسلامی علوم کا سمندر بہ رہا تھا تو یورپ کے تشنہ کام کیسے اس آب زلال سے محروم رہ سکتے ہیں۔ اسلامی علوم کا یورپ میں پہنچنے کا صرف ایک ہی ذریعہ نہ تھا بلکہ اس کے حسب ذیل ذرائع تھے:

(۱) اس کا پہلا ذریعہ تو یہ تھا کہ بعض علم کے شوقین حضرات نے جب اسپین کی علمی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کے دل میں بھی علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا کیونکہ وہ یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ ترقی کا پہلا زینہ علم کا حصول ہے۔

اور چونکہ ان کے ہاں علم کی جگہ جہالت کی فرماں روائی ہے اور اہل کلیسا جدید نظریات اور علم کے حصول کے سخت مخالف ہیں لہٰذا ان لوگوں نے علم حاصل کرنے کی خاطر اپنے شہروں سے نقل مکانی کیا اور مسلمان ممالک میں جا کر طلب علم میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ گیارہویں صدی میں کانسٹنٹائن (Constantine) شمالی افریقہ میں حصول علم میں مصروف تھا۔ ایڈلارڈ (Adelard) جو انگلستان کے شہر باتھ کا باشندہ تھا وہ سُوریا میں علم حاصل کرنے میں مصروف تھا۔ اٹلی کے شہر پیزا (Pisa) کا رہنے والا ایک شخص لیونارڈ (Leonard) جس نے یورپ میں موجودہ طریق حساب کی بنیاد رکھی (کیونکہ ایک سے دس تک ہندسے اور حساب کرنے کا طریقہ جو آج یورپ میں مروج ہے، وہ یورپ نے عربوں ہی سے سیکھا) اس نے اس طریقہ کو شمالی افریقہ کے عالموں سے سیکھا تھا۔ قسطنطنیہ اس زمانہ میں مشرقی رومی سلطنت بازنطینی (Byzantine) کا دارالسلطنت تھا۔ یہ اسلامی ممالک کے ساتھ ملتا تھا اس وجہ سے یہاں دونوں طرف سے لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ اس وجہ سے بھی کچھ عربی علوم عیسائی دنیا میں داخل ہوئے۔ سسلی کا جزیرہ اٹلی کے نیچے اور شمالی افریقہ کے علاقوں الجیریا اور ٹرپولی کے اوپر بحر روم میں واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت ۹۰۲ء سے ۱۰۹۱ء تک رہی۔ اس جزیرہ کو اگرٹارمن لوگوں نے فتح کر لیا لیکن پھر بھی یہاں مسلمان باشندوں کی کافی

تعداد باقی رہ گئی۔ یہ باقی ماندہ مسلمان گردونواح کے عیسائیوں کے استاد بنے اور ان کے ذریعے بہت سا علم یورپ میں پہنچا۔ ہسکن (Haskin) کے الفاظ ہیں ''تاہم وسیع نظر سے دیکھتے ہوئے یہ امر ظاہر ہے کہ ہسپانیہ کے عرب نئے علوم کو مغربی یورپ میں پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔'' (۴۳)

(۲) اسلامی علوم کا یورپ میں داخل ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ صلیبی جنگیں تھیں جو قریباً دو سو سال تک جاری رہیں۔ ان لڑائیوں کا اثر یورپ کی ذہنی ترقی پر بے اندازہ ہوا۔ چنانچہ مشہور مستشرق ولیم میور (W. Muir) نے لکھا ہے:

''یہ صلیبی جنگیں ہی تھیں جن کی وجہ سے مغربی دنیا اپنی طویل خواب غفلت سے بیدار ہوئی۔ انہی کی وجہ سے تمام یورپ کے سلاطین ایک نکتہ پر اکٹھے ہوئے جس کا مدعا اگرچہ شاندار تھا لیکن غلط تھا۔ اس طرح سے ان کے دلوں میں تازہ سیاسی روح پیدا ہوگئی۔ اس کا باعث براہ راست یا بالواسطہ اسلام ہی تھا۔ تجارت اور بحری کاروبار میں ان کے سبب سے ترقی ہوئی۔ اس طرح سے ان لڑائیوں نے یورپ کی دولت اور ثروت میں اضافہ کیا۔ فنون لطیفہ میں تازہ روح پھونکنے کا سبب بنیں، اور سائنس کے ایسے شعبوں مثلاً ہیئت، ریاضی، طب اور تاریخ قدرت کی علمی تحصیل کا باعث ہوئیں۔'' (۴۴)

بارکر (Barker) نے اپنی کتاب The Legacy of Islam, P.64 میں لکھا ہے کہ ''یورپ کے فنون اور ادبیات پر صلیبی جنگوں کے سبب اسلامی تمدن کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب نے اسلامی زبانوں کی تحصیل شروع کر دی اور مسلمانوں کے علوم کو ایک نئے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔''

ایسا ہی برڈو (Berdoe) نے بھی لکھا ہے۔ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ رابطہ اور تعلق پیدا کرنے کے بعد یورپ نے براہ راست یا بالواسطہ اپنی فضا میں وہ کیفیت پیدا کی جسے تہذیب یا تمدن کہتے ہیں۔ ان کی روح بیدار ہوگئی۔ تجسس و جستجو اور تفتیش و تلاش کا جذبہ پیدا ہوا۔ نگاہ میں وسعت، دل میں ہمت اور دماغ میں علم پیدا ہو گیا۔ چنانچہ یورپ کے باشندے ان جذبات کے ساتھ گھر سے نکلے اور ہر تکلیف و اذیت برداشت کر کے سائنس کا علم حاصل کیا اور دنیا میں صنعتی انقلاب پیدا کر کے پوری دنیا پر حاوی ہو گئے۔

مختصر یہ کہ اسلامی علوم کو یورپ نے جب قریباً تمام تر حاصل کر لیا تو ان میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کا سبب بھی بڑی حد تک اسلام ہوا۔ اسے ''نہضت علمی'' بھی کہتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ دنیا کی اس عظیم الشان ذہنی تبدیلی کے اسباب اور اس کی اہمیت کو آپ ایک مغربی

دانشور اور محقق کی زبانی سنیں۔ ہکسلے (Huxley) اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''اگر مغربی دنیا کو چین کی طرح سے بالکل الگ تھلگ رہنے دیا جاتا تو کچھ معلوم نہیں کہ کب تک یہ حالت قائم رہتی، مگر خوش قسمتی سے یہ بے تعلق نہ رہ سکی۔ تیرھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی اسپین میں عربی تمدن کے ترقی پذیر ہونے اور صلیبی جنگوں کی تحریک عظیم سے یورپ کا خمیر بننے کے لیے ایسا جامن لگا کہ اس دن سے آج تک اس نے اپنا کام موقوف نہیں کیا۔ پہلے تو عربی تراجم کی وساطت سے پھر اصل کتابوں کے مطالعہ سے یورپ کی مغربی اقوام قدیم فلسفیوں اور شاعروں کی تصنیفات سے اور ہوتے ہوتے عہد قدیم کے تمام وسیع ادبیات سے آشنا ہوگئیں۔'' (۴۵)

حوالہ جات

۱۔ الشفاء قاضی عیاض ۱/۳۹۰۔

۲۔ النحل: ۸۹۔

۳۔ نمل: ۷۵۔

۴۔ حم سجدہ: ۵۲۔

۵۔ الفوز الکبیر شاہ ولی اللہ محدث دھلوی ص ۱۲۔

۶۔ مفردات امام راغب۔

۷۔ روم: ۲۶۔

۸۔ الاعلیٰ: ۲۰۔۳۔

۹۔ الانفطار: ۶۔۷۔

۱۰۔ لسان العرب ۱۰/۸۵۔

۱۱۔ المؤمن:

۱۲۔ حج: ۷۲۔

۱۳۔ تفسیر عثمانی ص ۴۵۴۔

۱۴۔ حجر: ۸۲۔

۱۵۔ رعد: ۱۶۔

۱۶۔ فرقان: ۳۔

۱۷۔ القاموس ۴/۳۴۵، لسان العرب ۱۴/۳۱۲، مفردات امام راغب ص ۲۵۲۔

۱۸۔ روح المعانی ۳/۱۰۴۔

۱۹۔ تفسیر جواہر القرآن ملخصاً ۲۵/۱۱۲۔

۲۰۔ تفسیر کبیر للرازی ۸/۲۷۹۔

۲۱۔ قمر: ۴۹۔

۲۲۔ النازعات: ۲۷۔۲۸۔

۲۳۔ فرقان: ۲۔

۲۴۔ مفردات القرآن ص ۳۹۵۔

۲۵۔ یٰسین: ۳۹۔

۲۶۔ طلاق: ۳۔

۲۷۔ طٰہٰ: ۵۰۔

۲۸۔ ترجمان القرآن ۱/۴۴۔

۲۹۔ ایضاً: ۱/۴۵۔

۳۰۔ خدا ہمارے ساتھ ہے ص ۷۵۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ ایضاً ۸۵۔۸۷۔

۳۳۔ ہفت روزہ صدق جدید لکھنو ۶ جنوری ۱۹۶۲ء۔

۳۴۔ الاعلیٰ: ۳۰۲۔

۳۵۔ Stanislas Guyard: *Encyclopedia Des Sciences Religions*, P. 501

۳۶۔ Hearnshaw: *Mediaeval Contributions to Modern Civilization London*, P. 118

۳۷۔ Towner: *The Philosophy of Civilization*, Vol. 1, P.117

۳۸۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی ص ۱۱۰۔

۳۹۔ تاریخ اخلاق یورپ ۲/۱۰۴۔

۴۰۔ J.W. Draper: *Ahistory of the Intellectual Development of Europe* Vol. 1

۴۱۔ *Coflict between Science & Religion*

۴۲۔ Mohammad Asad: *Islam at the Cross Roads*, P. 40

۴۳۔ Haskin: *Studies in the History of Mediaeval Science* Page 5

۴۴۔ Muir: *The Mamluke or Slave Dynasty*, Introduction

۴۵۔ Huxley: *Science and Education*, P. 147